© rasailojaraid.com

علوم وفنون کی طرح دینی علوم ومعارف کی نعمت بھی اللہ تعالیٰ نے اس طرح تقسیم کی ہے کہ کوئی بھی حلقہ فکر دوسرے حلقہ ہائے فکر کی علمی وفکری کاوشوں سے مستغنی نہیں ہوسکتا اور تمام حلقہ ہائے فکر کی مساعی کو امت کی مجموعی علمی میراث کا حصہ سمجھتے ہوئے سب کی قدردانی اور اعتراف اور کسی تعصب کے بغیر سب سے اخذ واستفادہ ہی صحیح علمی رویہ ہے۔

کتاب کی کتابت وطباعت، کاغذ اور پیش کش کا معیار عمدہ اور کتاب کی علمی سطح کے شایان شان ہے۔ البتہ ٹائٹل کے آخری صفحے پر ناشر کی طرف سے ''ہماری چند خوب صورت اور معیاری مطبوعات'' کا عنوان دے کر ان مقالات کی ایک فہرست دے دی گئی ہے جو زیر نظر کتاب میں شامل ہیں۔ یوں بظاہر یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ تمام عنوانات مستقل تصانیف کے ہیں۔ اسی طرح کتابت کی بعض غلطیاں بھی ذوق سلیم کو ناگوار گزرتی ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں ان کی اصلاح کر لی جائے گی۔

اس مجموعے کو اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی نے شائع کیا ہے اور اس کی قیمت ۱۶۰ روپے (ہندوستانی) درج ہے۔ پاکستان میں غالباً یہ سجاد الٰہی صاحب کے پاس دستیاب ہوگی جو ہندوستان سے رسائل وجرائد مطبوعات منگوا کر اہل علم کو فراہم کرنے کا خاص ذوق رکھتے ہیں۔ (رابطہ: 0300-4682752)

(تبصرہ: محمد عمار خان ناصر)

Islamism and Democracy in India

The Transformation of Jamaat -e-Islami

(ہندوستان میں اسلام پسندی اور جمہوریت: جماعت اسلامی کی قلب ماہیت)

مصنف: عرفان احمد۔ صفحات: 306۔ قیمت: 695

ناشر: Permanent Black,'Himalayana,Mall road, Rani Khet Cantt. Rani Khet' (India) 263645

اسلام کا سیاست مرکزی تصور اسلامی نظام کے قیام کو اسلامی عقیدے اور عمل کا بنیادی پہلو قرار دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں جمہوریت اور سیکولرزم کے تصورات کو مسترد کر دیتا ہے۔ پچھلی تقریباً نصف صدی سے علمی وسیاسی حلقوں میں اس پر بحث ومباحثہ جاری ہے۔ نائن الیون کے بعد اس پر بحث میں تیزی آئی اور یہ اور اس سے متعلق موضوعات پر مختلف زبانوں میں اتنی کتابیں لکھی گئیں جو شاید گزشتہ کئی دہائیوں میں نہ لکھی گئی ہوں۔ عالم اسلام کے علما واہل دانش اور عوام کی اکثریت نے اس نظریے کو کبھی قبول نہیں کیا، وہ ہمیشہ اس کے خلاف رہی۔ اس لیے یہ نظریہ اسلامی فکر کے بنیادی دھارے میں شامل نہیں ہوسکا۔ تاہم اس وقت اسلام کو سیاسی tool کے طور پر استعمال کرنے والے اسلام پسند تمام اسلامی ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ بہت سی انقلابی اسلامی تحریکات اپنے مقصد اور فکری اساس کے اعتبار سے یہی تصور رکھتی ہیں۔ عرفان احمد کی زیر تبصرہ کتاب اسی موضوع کے ایک اہم پہلو پر لکھی گئی ہے۔ اسلام پسندی کے نظریے کی بانی سمجھی جانے والی جماعت اسلامی، ہند کے حوالے سے وہ اس نکتے سے بحث کرتی ہے کہ ہندوستان میں جمہوری عمل کے ساتھ اس کے تعلق اور کش مکش کی کیا شکل ونوعیت رہی ہے اور اس کے کیا اثرات اس کے فکری منہج اور عملی طریقہ کار پر مرتب ہوئے ہیں!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کئی سال کے مسلسل مطالعے اور پر مشقت فیلڈ ورک پر مشتمل یہ کتاب کئی حیثیتوں سے انفرادیت رکھتی ہے۔اس کے مندرجات نہایت چشم کشا ہیں۔اس کتاب میں پہلی مرتبہ تفصیل کے ساتھ اس بات کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عالم اسلام کی اس نوع کی دوسری جماعتوں سے قطع نظر، پچھلی نصف صدی سے زیادہ عرصے سے جماعت خود کو جمہوریانے کے عمل میں پوری طرح کوشاں رہی ہے۔مصنف کے مطابق ، جماعت کی بنیادی فکر میں تبدیلی کی شروعات ۱۹۶۰ سے ہوئی جب علما وعوام کی اکثریت کی طرف سے، جس میں علماے دیو بند پیش پیش تھے، پوری طرح جماعت کے اس نظریے کو مسترد کر دئے جانے پر جماعت نے دو الیکشن کے مکمل بائکاٹ کے بعد تیسرے الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔(ص:۲۱۸) یہ دل چسپ بات ہے کہ ۱۹۵۱۔۵۲ کے الیکشن میں امیر جماعت نے الیکشن میں مسلمانوں کے حصہ نہ لینے کے لیے باضابطہ مہم چلائی۔لیکن ۱۹۸۰ میں خود اپنے ارکان کو اس کی اجازت دینی پڑی (ص:۱۹۷) جب کہ ۲۰۰۲ کے الیکشن میں اس نے سیکولر پارٹی کی جیت کے لیے باضابطہ انتخابی مہم چلائی۔(ص:۲۲۰)

اس کے بعد نصف صدی کے عرصے میں حکومت الٰہیہ کو اپنا اولین ہدف قرار دینے والی اور سیکولر جمہوریت کو ''طاغوت'' اور'' جاہلیت'' اور''خنزیر کی طرح حرام'' تصور کرنے والی جماعت اسی سے اپنا رشتہ استوار کرتی رہی ہے۔ مولانا مودودی نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سمیت تمام جمہوری عصری اداروں کو''قتل گاہ'' قرار دیا تھا لیکن اب انہی قتل گاہوں میں جماعت اسلامی زندگی کی تلاش میں ہے۔مصنف نے کتاب کے ساتویں اور آخری باب (ص:۱۸۸۔۲۱۶) میں جماعت کے اس قلب ماہیت کا مدلل و مفصل تجزیہ پیش کیا ہے۔یہ پوری 'داستان عبرت' دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔جماعت کی سرپرستی میں چلنے والے علی گڑھ کے گرین اسکول کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس پر سرے سے کسی آئڈیالوجی کا کوئی اثر نہیں ہے۔اس میں اور عام اسکولوں میں کوئی فرق نہیں۔طلبہ کے والدین کی اکثریت اسکول کے پس منظر سے واقف بھی نہیں اس کے کارکنان کو اس کا احساس بھی نہیں۔افراد اور ادارے کی سطح پر جماعت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جماعت کا دعوا خواہ جو بھی ہو، لیکن جماعت کی خاموش ترجیح سیکولر جمہوریت سے ہی قربت تلاش کرنا رہی ہے۔اپنی تحقیق اور تجزیے کی بنیاد پر مصنف اس خیال کو غلط ٹھہراتے ہیں کہ جماعت کے اندر یہ تبدیلی محض ظاہری ہے۔ان کی نظر میں اس تبدیلی کا تعلق جماعت کے اندرون سے ہے۔خود اس کے فکری ڈھانچے میں گہرائی کے ساتھ تبدیلی آئی ہے۔(ص:۲)

کتاب کا چوتھا، پانچواں اور چھٹا باب جماعت اسلامی کی فکر کی بنیاد پر قائم ہونے والی دو طلبہ تنظیموں: سیمی (SIMI) اور ایس آئی او (SIO) کے تقابلی مطالعے پر کے مختلف اہم پہلوؤں پر مشتمل ہے۔اس کے لیے مصنف نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، اعظم گڑھ میں جماعت کی طرف سے قائم مدرسے جامعۃ الفلاح میں فیلڈ ورک کے طور پر کافی وقت گزارا اور دونوں تنظیموں سے منسلک طلبہ کی تنظیمی واجتماعی سرگرمیوں کو قریب سے دیکھنے، پڑھنے کی کوشش کی۔دونوں جگہوں پر وہاں کے طلبہ اور کارکنان واساتذہ سے پیہم ملاقاتیں کر کے دونوں گروپ کے طلبہ وکارکنان کی ذہن کی ساخت اور اس کے تشکیلی عوامل کو سمجھنے کی جدوجہد کی تاکہ ایک ہی پس منظر رکھنے والے دونوں طلبہ گروپوں کے بالترتیب اعتدال پسندی اور ریڈیکلزم کے رویے کے بنیادی اسباب کا اندازہ کیا جا سکے۔مصنف کی نظر میں سیمی کی انتہا پسندانہ ذہنی تشکیل میں بنیادی طور پر ہندوتو طاقتوں کے اسی اور نوے کی دہائیوں کے عروج نے اہم رول نبھایا ہے۔خاص طور بابری مسجد کے انہدام اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے مابعد ملک گیر فسادات نے سیمی کو ہندوستان جیسے ملک میں بھی جہاد کا راستہ اختیار کرنے پر مائل کیا۔ قابل غور ہے کہ مصنف کے مطابق ۱۹۹۱ء سے قبل سیمی کے اندر جہاد کا رجحان نہیں پایا جاتا تھا۔ ان کا مطالعہ جن نتائج پر مشتمل ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی نظر میں سیمی کا ظاہرہ (phenomenon) ہندوستان کے سیکولر جمہوری نظام کی ناکامی کی پیداوار ہے۔ سیمی کے جماعت کی سرپرستی سے محرومی اسی کے ساتھ اس سے متعلق طلبہ کے سماجی پس منظر کو بھی کافی دخل رہا ہے۔ سیمی کے کارکنان شہری علاقوں اور خوش حال خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد اور سرپرستوں کی تعلیم مدارس کے ساتھ عصری درس گاہوں میں بھی ہوئی ہے۔ وغیرہ۔ ایس آئی او کی صورت حال بہت حد تک اس کے برعکس ہے۔ جس کی قابل ذکر تفصیلات مصنف نے پیش کی ہیں۔

یہ مطالعہ اس بات کو ثابت کرتا ہے اور مصنف کا اپنا نقطہ نظر یہی ہے کہ اسلام پسندی کا نظریہ کوئی جامد اور بے لچک نظریہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ بہت سے دوسرے نظریات کی طرح ایک متحرک نظریہ ہے۔ جس میں زمانی و مکانی احوال وواقعات کے نتیجے میں ہمیشہ تبدیلی کی گنجائش رہتی ہے۔ ہم اسے اس پورے مطالعے کا حاصل کہہ سکتے ہیں۔ اسلام پسندی سے متعلق خاص طور پر مغرب کے سیاسی وفکری حلقوں میں اس وقت جو نظریات پائے جاتے ہیں، یہ نظریہ بہت حد تک ان سے مختلف اور حوصلہ افزا ہے۔ اس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حالیہ عرصے میں مختلف ملکوں کی اسلامی تحریکات کے اندر جو انتہا پسندانہ رجحانات سامنے آرہے ہیں وہ عبوری ہیں مستقل نہیں ہیں۔ مشرق وسطی میں ان رجحانات کی پرورش میں وہاں کے غیر جمہوری سیاسی ماحول کا بنیادی دخل رہا ہے جس کی بقا نہی عالمی طاقتوں کی رہین منت ہے جو ان تحریکات سے سب سے زیادہ خائف ہیں۔ یہ پیراڈاکس فکر کا اہم مقام ہے۔

اسلامی اور سیاسی حلقوں کے لیے یہ مطالعہ ایک اہم بنیاد فراہم کرتا ہے کہ وہ ان کمزوریوں اور کا جائزہ لے سکیں جو بعض مسلم گروپوں میں انتہا پسندی کے فروغ کا سبب بنی ہیں یا بن رہی ہیں۔ خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ عرفان احمد نے نہایت مدلل طور پر اس بات کو ثابت کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے کہ بعض مسلم حلقوں میں ریڈیکل رجحانات کی پیدائش اور افزائش کا تعلق مذہبی نظریات سے نہیں، جیسا کہ ہن ٹنگٹن اور برنارڈ لیوس جیسے لوگ کہتے رہے ہیں، بلکہ اس کا تعلق سماجی حالات سے ہے۔ مذہبی نصوص کی تشریح وتطبیق افراد اور جماعتوں کی خود اپنی تاثر پذیر ذہنیت کا مرہون منت ہوتی ہے۔ یہ بشریاتی مطالعہ انتہا پسندی کی جڑوں کی تلاش ودریافت کے لیے کیے گئے حالیہ مطالعات میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کے تعلق سے اپنی نوعیت کا یہ پہلا مطالعہ ہے۔ جو اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے ایک مضبوط زمین فراہم کرتا ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب سے سوچنے والوں کو نئی جہت ملے گی اور بہت سی ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے گا جو اب تک مسلم اور غیر مسلم فکری وسیاسی حلقوں میں پائی جاتی رہی ہیں۔

ڈاکٹر عرفان احمد ہندوستان کے صوبہ بہار سے تعلق رکھنے والے نوجوان وذہین قلم کار ہیں۔ طالب علمی کے زمانے سے مختلف اہم موضوعات پر لکھتے رہے ہیں۔ دہلی جواہر لال نہرو یونی ورسٹی سے انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی ہے۔ اس وقت وہ آسٹریلیا کی موناش یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

(تبصرہ نگار: محمد وارث مظہری)

© rasailojaraid.com